Gohar e tehqeeq گوہر تحقیق
گورنمنٹ صادق کالج ویمن یونیورسٹی بہاول پور

Year 2024;Vol 03 (Issue 02)

P.25-37 https://journals.gscwu.edu.pk/

ہما سید

پی ایچ ڈی سکالر، شعبہ اردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاولپور

ڈاکٹر محمد عبید اللہ

صدر شعبہ اردو و اقبالیات، اسلامیہ یونی ورسٹی، بہاول نگر کیمپس

Huma Syed
Ph.D. Scholar, Islamia University, Bahawalpur
Dr. Muhammad Obaid Ullah
Head of Urdu Department, Islamia University, Bahawalnagar Campus

فیض احمد فیض: پس نو آبادیاتی عہد میں مزاحمت کا استعارہ

Faiz Ahmed Faiz: A Metaphor of Resistance in the Postcolonial Era

Abstract:

This article attempts to provide a comparative study of the background of the Progressive Movement and the post- colonialism era of Urdu poetry. An overview of the stages through which Urdu poetry, under the influence of colonialism and the Progressive Movement, underwent the post-colonial era of Pakistan and India. Progressive movement started in 1936 in Sub Continent. This movement influenced Urdu literature. As far as poetry is concerned, it was greatly influenced by this movement. A lot of poets took part in this movement. Faiz and Jalib were also among these poets. Fiaz was an active member of progressive movement. He wrote poems which are a reflection of progressive movement. Jalib was also the member of progressive movement. He accepted prison, punishment and fine, but did not leave this movement. The article is about resistant poetry of Faiz Ahmed Faiz and his role in progressive movement.

Keywords: Post- colonialism; background, Britain's usurping occupation and colonial system in the Subcontinent. Faiz Ahmed Faiz Progressive Urdu Poet.

"نو آبادیات" ایک اردو اصطلاح ہے جو انگریزی لفظcolonialism کے متبادل کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ نو آبادیاتی نظام سے مراد کسی ایک علاقے کے لوگوں کا دوسرے علاقے میں جا کر اپنی نئی آبادیاں قائم کرنا اور ارد گرد کے علاقوں پر قبضہ کر کے اسے / انھیں توسیع دینا ہے۔ جہاں یہ نو آبادی قائم کی جاتی ہے وہاں کے اصل باشندوں پر، قابض گروہ، عموماً اپنے قوانین، معاشرت اور حکومت بھی مسلط کر دیتے ہیں۔ پوسٹ کلونیل ازم Postcolonialism دراصل کلونیل ازم کے تباہ کن اثرات کا جائزہ لینا، اور ذہنی، تاریخی و ثقافتی غلامی کو دوام دینے لیے گھڑے گئے مہابیانیوں کے اسیر مقامی آدمی کو فکری آزادی دلانے کے لائحۂ عمل کا تعین کرنا، نو آبادکار کے لسانی، ثقافتی اور استعماری حربوں کی قلعی کھول کر اس کے اثرات کو زائل کرنے کے لیے متبادل بیانیوں کا تعین کرنا وغیرہ، سب کچھ مابعد نو آبادیات Postcolonialism کہلاتا ہے۔ یہ ایک فکری، ادبی اور نظریاتی تنقیدی نقطۂ نظر ہے جو نو آبادیاتی طاقتوں کی طرف سے قبضے، تسلط، اور ثقافتی غلبے کے بعد پیدا ہونے والے اثرات، مزاحمت، شناخت اور ثقافتی احیاء کی کوشش کرتا ہے۔

نو آبادیاتی نظام اور برصغیر کا تعلق بہت گہرا اور تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ برصغیر (یعنی موجودہ پاکستان، بھارت، بنگلہ دیش) قریباً قریباً دو سو سال تک نو آبادیاتی نظام کا شکار رہا، خاص طور پر برطانوی سامراج کے زیرِ اثر رہا۔ اس عرصے میں برصغیر کی سیاست، معیشت، ثقافت، تعلیم اور نفسیات پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ پس نو آبادیاتی مطالعات کے پس پردہ ایک طرح کا مزاحمتی جذبہ کارفرما ہوتا ہے لیکن یہ مطالعات مزاحمتی ادب سے کئی حوالوں سے مختلف بھی ہیں۔ مزاحمتی ادب اور پس نو آبادیاتی مطالعات میں قدرِ مشترک یہ بھی ہے کہ دونوں مستضعفین اور محروم طبقات کی حمایت کرتے ہیں اور دوسرا یہ کہ دونوں کا ظہور آمریت کے ردعمل کے طور پر ہوتا ہے۔

مزاحمتی ادب اس ادبی رجحان کو کہا جاتا ہے جو ظلم، جبر، ناانصافی، استحصال، آمریت یا نو آبادیاتی تسلط کے خلاف آواز بلند کرتا ہے۔ یہ ادب کسی طاقتور نظام یا قوت کے خلاف مزاحمت یعنی مخالفت یا احتجاج کی صورت اختیار کرتا ہے، اور oppressed مظلوم طبقات، اقوام یا افراد کے جذبات، تکالیف اور جدوجہد کو بیان کرتا ہے۔

مزاحمتی ادب کی اصطلاح پہلی بار فلسطینی مصنف "غسان کنفانی" نے کی ہو یا "باربرا ہارلو" نے، لیکن اتنا یقینی ہے کہ مزاحمتی ادب کی اصطلاح عہدِ آمریت میں وجود میں آئی۔ اس طرح ایک جانب ویتنام، فلسطین اور الجزائر کی آزادی کے لئے لکھا گیا

ادب مزاحمتی ادب کہلایا تو دوسری جانب حاشیائی آبادی کی حوصلہ افزائی میں تحریر کردہ ادب بھی مزاحمتی ادب شمار کیا گیا۔ اہل قلم نے ہمیشہ ظلم و جبر کے اندھیروں کے خلاف حق اور سچائی کے چراغ روشن کئے ہیں۔ ہر سچا شاعر اور ادیب مظلوم کے ساتھ کھڑا ہوتا ہے۔ کسی بھی قوم کا حساس طبقہ غربت، افلاس، ظلم و بربریت، قتل و غارت اور شخصی آزادی چھن جانے کے بعد جبر واستبداد اور غلامی کے خلاف مزاحمت کرتا ہوا اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ شاعر اور ادیب سماج کا ایسا طبقہ ہوتے ہیں، جو محسوس کر سکنے اور اس کے اظہار کی طاقت رکھتے ہیں۔ چنانچہ وہ قلم کے ذریعے جدوجہد کرتے نظر آتے ہیں۔

مزاحمت در حقیقت ان آزاد سماجی و ثقافتی رویوں کے جبری استحصال سے انکار کا نام ہے، جو سیاسی و عمرانی دباؤ کے تحت انسانی زندگی میں در آتا ہے۔ اسی جبری برتاؤ اور دستور کو جب ایک ادیب یا شاعر اپنے الفاظ میں ایک جدوجہد کا نام دیتا ہے تو اسے ہم مزاحمتی ادب کی شرح میں قبولیت بخشتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ آزادی کا حصول ایک مرحلہ وار اور ہمہ جہت جنگ کی شکل میں ہوتا ہے۔

ادب ایک انکشاف ہے۔ بڑا ادیب معاشرے اور فرد کے باطنی تموّجات اور محرّکات کا سراغ لگاتا ہے، جو پنہاں ہے اس کو عیاں کرتا ہے اور حقائقِ ہستی کے ان گوشوں کو روشن کرتا ہے جو عموماً ہماری نظروں سے اوجھل ہوتے ہیں۔ ہر صاحب فکر شاعر کی اپنی مخصوص لفظیات اور رمزیات ہوتی ہیں جن کے سہارے وہ اپنی بات دوسروں تک پہنچاتا ہے۔

نو آبادیات کے بعد کا دور پس نو آبادیاتی عہد کہلاتا ہے۔ یعنی نو آبادیاتی نظام سے چھٹکارا پا لینے کے بعد کا دور۔ اس اصطلاح اور سوچ کو ایڈورڈ سعید کی 1978 میں شائع ہونے والی کتاب "اورنٹیل ازم" سے منسوب کیا جاتا ہے۔ لیکن ان سے کہیں پہلے "ایمی سیزائر" اور" فرانز فینن "نے پس نو آبادیات کے تصور اور اس کے اثرات کو پیش کیا۔ فرانز فینن کی کتاب "Wretched of the Earth" کا اردو ترجمہ "افتادگانِ خاک" کے عنوان سے 1978 سے پہلے شائع ہو چکا تھا۔ نایڈورڈ سعید پس نو آبادیاتی نظریہ سازی کا اہم ترین نام ہے۔ گو کہ ان کی فکر پر انتونیو گرامچی، مشیل فوکو اور فرانز فینن کے بھی اثرات ہیں تاہم پس نو آبادیات کو ایک نظریے اور ایک شعبۂ علم کی حیثیت دینے میں ایڈورڈ سعید کا اہم کردار ہے۔

اپنی تصنیف "شرق شناسی" میں سعید کہتا ہے کہ اورینٹ یعنی شرق کا تصور جن معنوں میں امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں پیش کیا جاتا ہے وہ حقیقت پر مبنی نہیں ہے بلکہ یہ عوام کے ذہنوں پر مسلط کیا ہوا ایک خود ساختہ تصور ہے۔ اس بنیادی غلط فہمی کا سبب مشرق اور مغرب کے مابین صدیوں پرانی طاقت کی حرکیات اور بیانیے ہیں۔ ان ابتدائی غلط فہمیوں کا مقصد مشرق میں

سامراج کی سرگرمیوں اور بیانیے کو تقویت دینا تھا۔ سعید کا کہنا ہے کہ یہ غلط فہمیاں آج بھی مغرب اور مشرق کے درمیان موجود ہیں۔ مشرق سے متعلق مغرب کے علم کے حوالے سے ایڈورڈ سعید بلا تامل کہتا ہے کہ یہ علم حقائق پر مبنی نہیں ہے بلکہ پہلے سے قائم شدہ اس مفروضے پر مبنی ہے کہ مشرقی معاشرے مغربی معاشرے سے متضاد اور بنیادی طور پر ایک دوسرے سے متخالف ہیں۔ اس نظریے نے مشرق کو مغرب کے لئے غیر مہذب بنادیا ہے۔

اگر برصغیر کے تناظر میں پس نو آبادیات کو دیکھا جائے تو دو ممالک کی تقسیم کے باوجود نو آبادیات کا اختتامیہ اور پس نو آبادیات کا ابتدائیہ ابھی بھی انہی مراحل میں ہے جہاں یہ دنوں ممالک ایک دوسرے سے علاحدہ ہوئے تھے۔ کیونکہ نو آبادیات کے تسلط تلے دبے اذہان اس تبدیلی کے توخواہش مند تھے جس سے انہیں سامراجی اور استعماری تسلط سے چھٹکارامل جائے مگر زنجیر سے پاؤں نکل جانے کے باوجود ذہن زنجیر کے بوجھ اور اُس کی جھنکار کے خوف و رعب میں آج بھی گرفتار ہے۔ نئے ملک کا خوش کن تصور صرف آزادی کا تصور نہ تھا بلکہ سامراجیت اور غلامی کے احساس سے نکل جانے کا احساس بھی تھا۔ نئ مملکت کے قیام سے ہی پس نو آبادیات کا دور شروع ہونا چاہیے تھا مگر نوزائیدہ مملکت مسائل کا شکار ہو کر عوامی توقع پر پوری نہ اتر سکی اور نو آبادیاتی نظام سے براہِ راست نئے نو آبادیاتی بندوبست کا شکار ہو گئی۔

پس نو آبادیات کے حوالے سے فیض احمد فیض کی نظموں کو دیکھا جائے تو ان کے لیے یہ کہنا بہت ضروری ہے کہ فیض احمد فیض بلاشبہ موجودہ دور کے ایک بہت بڑے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری میں رومان کے ساتھ ساتھ احتجاج کا پہلو بھی نمایاں ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں ظلم، بربریت، استحصال اور جبر کے خلاف آواز اٹھائی اور جابروں، ظالموں اور آمروں کے نظریات کے خلاف قلمی جہاد کیا۔

فیض دورِ حاضر کے پسِ نو آبادیاتی دور کی ترقی پسند شاعری کے بڑے اور اونچے نمائندے ہیں لیکن ان کے کلام میں یہ رنگ آہستہ آہستہ مزاحمتی شاعری کے طور پر اُبھرا۔ ان کو غریبوں کی حمایت کا احساس اور بازار میں مزدوروں کے گوشت کی خرید و فروخت کا غم تو ابتداء ہی سے تھا لیکن وہ اس شرم ناک صورت حال کو اجداد کی میراث تصور کر کے دل کو تسلی دیتے تھے۔ لیکن ساتھ ہی وہ رجائیت کے پہلو کو بھی ہر دم سامنے رکھتے ہیں کہ آخرِ کار یہ ظلم کا نظام ایک دم اپنے ہی بوجھ سے ضرور زمیں بوس ہو کر رہے گا۔

اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں بار ستم

آج سہنا ہے ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے (۱)

فیض کی تکرار ہمیشہ ان کرداروں سے رہی جو جبر، تسلط اور ظلم و ستم کے دل دادہ تھے۔ انہوں نے معاشرے کے ان لوگوں کی بات کی جن کی حمایت میں بات کرنا مشکل ترین کام تھا مگر اس گھٹن کے ماحول میں بھی فیض نے دستِ تہِ سنگ کو دستِ صبا تو کبھی بادِ صبا کے مترادف کر دکھایا۔ وہ جبر میں بھی مایوس نہیں؛ حوصلہ اور امید ان کو ہالہ کیے رکھتے ہیں اور یہی حوصلہ وہ اپنے لفظوں کے ذریعے سے دوسروں میں منتقل کرتے ہیں۔ وہ اپنے فن کے توسط سے یہ پیغام دیتے ہیں کہ ظلم و جبر کی سیاہ رات دائمی نہیں۔ اجنبی ہاتھ کو جبری تسلط کا استعارہ کہیں یا نو آبادکار کا طاقت کا بیانیہ، دونوں صورتوں میں امید کی کرن دوسرے مصرعے میں ہویدا نظر آتی ہے۔

یہ تسلط چاہے نو آبادیاتی نظام میں سامراج کا ہو یا پس نو آبادیات میں طاقت ور کے ہاتھ کا، دونوں صورتوں میں جبر کا شکار مظلوم ہیں مگر دوسرے حصے میں امید ہے، آس ہے، روشنی کی کرن ہے اور امکانِ سحر موجود ہے۔

ڈاکٹر نسرین بیگم لکھتی ہیں:

"ترقی پسند تحریک کا اثر فیض کی شاعری پر گہرا ہوا اور یہ تحریک فیض کو رومان کی وادی سے انقلاب کی دنیا میں لے آئی۔ اس تحریک نے ان کی شاعری کے حسن کو جلا بخشی اور اسے نئے انداز سے روشناس کرایا۔" (۲)

بقول نوشین توقیر:-

"فیض صاحب ایسے شاعر تھے جنہوں نے ہر حال میں اپنے مزاحمتی نظریات کا ساتھ دیا۔ انھوں نے ہزاروں سختیاں سہنے کے باوجود اپنے نظریات سے اور اپنے نظریات کے پرچار سے منہ نہ موڑا۔ انہوں نے دنیا بھر کے محنت کشوں کو اتحاد کا پیغام دیا۔" (۳)

ڈاکٹر جمیل جالبی نے فیض کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"فیض نے غلامانہ دور کی تصویر کشی کی ہے، مظلوم و محکوم قوم کی دردناک زندگی کے رخ کو پیش کیا ہے، ظالم و جابر آقاؤں کے طرز عمل پر شدید حملے کیے ہیں، لیکن ان کا وصف یہ ہے کہ تلخ و ترش واقعات کی شدت شعر کے لطیف پردوں میں اس طرح اجاگر ہوتی ہے کہ شعریت اور سیاست دونوں ایک دوسرے میں بالکل شیر و شکر ہو گئے ہیں" (۴)

ان کی نظموں میں سیاسی نقطہ نظر کے ساتھ ساتھ جذبے کی سچائی اور خلوص بھی ہے۔ وہ سیاسی موضوعات کو کھلے طریقے سے خطیبانہ اور واعظانہ انداز میں نظم کر دینے یا بندھے ٹکے نعروں کو اوڑھنا بچھونا بنانے سے گریز کرتے ہیں۔ ان کے یہاں سیاسی اور احتجاجی و انقلابی رجحانات میں جو امتزاج پایا جاتا ہے وہ شاعرانہ حسن سے پوری طرح مالامال نظر آتا ہے اور یہی حسن ان کی نظموں کی اہم خوبی ہے۔ ان کی نظم "آج بازار میں پابجولاں چلو" اس کی بہترین مثال ہے۔ اس کا یہ بند ملاحظہ ہو :

چشمِ نم جانِ شوریدہ کافی نہیں

تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں

آج بازار میں پابجولاں چے چلو

دست افشاں چلو مست ورقصاں چلو (۵)

قید و بند کے تجربے اور سیاسی مزاحمت کے سیاق میں لکھی۔ اس نظم کا پس منظر ریاستی ظلم، آمریت، اور جبر کے خلاف انقلابی اظہار پر مبنی ہے۔ یہ نظم اُس وقت لکھی گئی جب فیض کو راولپنڈی سازش کیس میں گرفتار کیا گیا تھا، اور انھیں قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنا پڑیں۔ "آج بازار میں پابجولاں چلو" کا مطلب ہے کہ قید، ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں ہیں مگر اس جبر، ظلم اور ناانصافی کے باوجود عزت و وقار سے، سربلند ہو کر عوام کے سامنے جاؤ۔ نظم کا یہ پس منظر صرف ذاتی قید کی کہانی نہیں، بلکہ ہر اس شخص یا طبقے کی نمائندگی کرتا ہے جو جبر، ظلم اور ناانصافی کا شکار ہو، اور پھر بھی سر جھکائے بغیر مزاحمت کرے۔ یہ نظم استعارہ ہے سیاسی جدوجہد، سچائی، اور انقلابی وقار کا۔ فیض کو سوشلزم (اشتراکیت) سے وابستگی اور آزادانہ اظہار خیال کی کڑی سزا بھگتنا پڑی اور اپنی زندگی کے بہترین ماہ و سال قید میں رہ کر گزارے، لیکن فیض کی فکر پر پہرے نہ لگائے جا سکے اور نہ ان کے نظریات پر پابندی لگائی جا سکی۔ چناں چہ عین گرفتاری کے دوران بھی فیض نے انقلابی خیالات کا اظہار جاری رکھا:

اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو ! وہ وقت قریب آپہنچا ہے

جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں

جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے (٦)

انقلاب کا یہ تصور کشت و خون سے ہو کر گزرتا ہے۔ زنداں میں فیض کے دل و دماغ پر قیامت گزر گئی جب فیض کو "غدار وطن" کا نام دیا گیا اور وطن دشمنی کے الزامات لگائے گئے۔ یہ نظم اُس وقت لکھی گئی جب پاکستان میں سیاسی آزادی سلب کی جا رہی

تھی۔ آمریت کا دور دورہ تھا، اور بہت سے ادیب، شاعر، صحافی اور سیاسی کارکن جیلوں میں تھے۔ فیض خود بھی کئی بار قید میں رہے، خاص طور پر راولپنڈی سازش کیس کے دوران میں ۔ فیض نے ہمیشہ مظلوم عوام، مزدوروں، کسانوں اور محکوم طبقات کے حق میں آواز بلند کی۔ یہ نظم ایک انقلابی نوید ہے کہ ظلم کی زنجیریں اب ٹوٹنے والی ہیں، اور جیلوں، قید خانوں، اور ظالموں کا خاتمہ ہونے والا ہے۔

نظم میں "زنجیریں" اور "زندان" جیسے الفاظ صرف قید و بند کے مادی مظاہر نہیں بلکہ استعاراتی طور پر ظلم، جبر، آمریت، اور استحصالی نظام کی علامتیں ہیں۔ یہ شاعری امید، بغاوت، اور انقلاب کا پیغام دیتی ہے۔

فیض کی یہ نظم اس وقت مقبول ہوئی جب عوام جبر کے خلاف اُٹھنے لگے تھے۔ یہ نظم اُن کے جذبات کی ترجمان بنی، اور مظلوموں کو حوصلہ دیا کہ آزادی ممکن ہے۔ وہ دن دور نہیں جب ظالموں کو ظلم کا جواب دینا پڑے گا۔ پس نو آبادیاتی تناظر میں یہ پاکستان کے مارشل لاء کے زمانے میں جبر اور اجارہ داری کے خلاف لکھی گئی نظم ہے جس میں آمرانہ نظام سے شدید نفرت اور مخالفت کی بو آتی ہے۔ مگر حوصلہ اور امید ساتھ ساتھ ہیں۔ فیض کی شاعری کا وہ دور جو پس نو آبادیات سے منسلک ہے اس میں ان کی شاعری خواب سے حقیقت، رومان سے مزاحمت اور فرد سے معاشرے کی طرف سفر کرتی ہے۔ یہ نظمیں آزادی کے کرب، جبر کے خلاف آواز، اور ایک روشن مستقبل کی امید کی دستاویز ہیں۔

فیض کی نظموں میں قنوطیت اور رجائیت کے امتزاج نے انھیں اردو ادب کے افق پر منفرد جگہ دی ہے۔ ان کی نظموں میں قنوطیت کا رنگ زندگی کی تلخیوں، معاشرتی ظلم اور ناانصافی کے خلاف ایک دردناک احتجاج کے طور پر ابھرتا ہے۔ یہ وہ جذبات ہیں جو ان کے عہد کے سیاسی اور سماجی منظرنامے کی تصویر کشی کرتے ہیں، جہاں امید کی روشنی مدھم نظر آتی ہے۔

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے / ہیں زمیں بوس راحتوں کے / محل مٹ گئے قصہ ہائے فکر و عمل! / بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیف کوثر و تسنیم / زحمت گریہ و بکا بے سود / شکوۂ بخت نارسا بے سود / ہو چکا ختم رحمتوں کا نزول
بند ہے مدتوں سے بابِ قبول / بے نیاز دعا ہے ربِ کریم / بجھ گئی شمع آرزوئے جمیل / یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظار فضول رہنے دے / راز الفت نباہنے والے / بار غم سے کراہنے والے / کاوش بے حصول رہنے دے (یاس)"(۷)

؎ اداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں
محبت کی دنیا پہ شام آچکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں
ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں (۸)

دوسری جانب فیض کی شاعری رجائیت کی ایک گہری جھلک بھی پیش کرتی ہیں، جو مشکلات کے درمیان ایک نئی صبح کی امید جگاتی ہے؛ بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے۔

؎ آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے (۹)

؎ اس بام سے نکلے گا ترے حسن کا خورشید
اس کنج سے پھوٹے گی کرن رنگ حنا کی (۱۰)

فیض کی مزاحمتی شاعری صرف قومی سطح کی نہ تھی بلکہ بین الاقوامی حدوں تک وسیع تھی۔ 1953ء میں جب فیض پابندِ سلاسل تھے، ایران میں ایک نئی سامراجی چال کھیلی جارہی تھی اور امریکہ اور برطانیہ ایک منتخب حکومت کا تختہ الٹنے کی تیاریوں میں تھے۔ اس نئے کھیل میں ایرانی وزیراعظم مصدّق کی حکومت کو برطرف کرکے شاہ ایران کے ہاتھ مضبوط کیے جارہے تھے لیکن شاہ کو ایک ملک گیر تحریک کے بعد ملک چھوڑنا پڑا۔ نئ نسل کی تحریک کو اس سازش کے خلاف احتجاج کی پاداش میں بڑی بے دردی سے کچل دیا گیا جس میں نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد نے قربانی دی اور شاہ کو دوبارہ مسندِ شاہی پر بٹھا یا گیا۔ فیض نے ایرانی نوجوانوں کے اس قتل عام پر" ایرانی طلبہ کے نام "ایک نظم میں نئ نسل کی قربانی اور ان کی شجاعت کو ہیرے موتیوں سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا:

یہ کون سخی ہیں / جن کے لہو کی / اشرفیاں چھن چھن، چھن چھن، / دھرتی کے پیہم پیاسے / کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں کشکول کو بھرتی ہیں / یہ کون جواں ہیں ارض عجم / یہ لکھ لٹ / جن کے جسموں کی / بھرپور جوانی کا کندن / یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے / یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے / اے ارض عجم، اے ارض عجم! / کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دئے ان آنکھوں نے اپنے نیلم / ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں / ان ہاتھوں کی "بے کل چاندی / کس کام آئی کس ہاتھ لگی"(ایرانی طلبا کے نام)

برصغیر کا یہ لازوال شاعر جب آمریت، ظلم کے مقابلے میں آزادی کی بات کرتا ہے تو وہ صرف جنوبی ایشیا کی نہیں پوری دنیا کی کہانی بیان کرتا ہوا حریت اور امن کا پیغام سناتا ہے۔

بقول شارب ردولوی:

"فیض کی شاعری کی ایک مخصوص جہت زندگی کو زیادہ خوبصورت اور دلکش، دنیا کو پر امن اور پر مسرت، بنی نوع انساں کو خوف، جنگ اور ظلم سے بے نیاز دیکھنے کی خواہش ہے۔ یہ خواہش فیض کی یہاں اس قدر شدید ہے کہ شاید ان کے تمام جذبوں پر حاوی ہے۔"

فیض کی ایک اور نظم "تین آوازیں" ظلم اور آزادی کے تصور کو موثر انداز میں تین حصوں میں بیان کرتی ہے، ظالم، مظلوم اور ندائے غیب۔ پہلے حصے میں ظالم کی درندگی کو اسی کی آواز میں یوں طشت ازبام کیا گیا ہے:

جشن ہے ماتمِ امید کا آؤ لوگو / مرگِ انبوہ کا تہوار ہے آؤ لوگو / عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے

جلوہِ صبح سے کیا مانگتے ہو؟ / بستر خواب سے کیا مانگتے ہو؟ (۱۱)

پاکستان کے قیام کے بعد جب عوامی خوابوں کے برعکس فوجی آمریت کے جبر، قیدو بند اور استحصالی حکمرانی کا نیا دور شروع ہوا تو فیض نے اپنی نظموں میں اُس دور کی تلخ حقیقتوں کو بھی انتہائی جرات مندی کے ساتھ پیش کیا۔

فیض کی شاعری میں ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کی شدت اس وقت اور بھی نمایاں ہو گئی جب آزادی کے بعد وہی سامراجی ہتھکنڈے نئے حکمرانوں نے عوام پر مسلط کیے۔ پاکستان میں جاگیرداروں، سرمایہ داروں اور فوجی جرنیلوں کی ملی بھگت نے ایک نیا نوآبادیاتی نظام ترتیب دیا، جس میں عوام کی آزادی، فلاح اور بنیادی حقوق سلب ہوتے گئے۔ اور اس طریقہ کار کو اپنایا گیا جس میں بیرونی قوتیں بیرونی تسلط کی بجائے اپنے اس خطے میں خفیہ ہاتھ تلاش کر کے اپنی ڈوریں ان کے ہاتھوں سے استعمال کرنے لگیں۔ فیض نے اس صورتِ حال کو اپنی نظموں میں شدتِ احساس اور گہری علامتی زبان میں بیان کیا۔ "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" میں جہاں محبوب کے حسن کا تذکرہ ہے، وہیں ان اندھیری گلیوں کا ذکر بھی ہے جہاں استحصالی نظام کے سبب انسانیت سسک رہی تھی۔ اور انسان غلامی کے ان دیکھے طوق کو سنبھالے حکمرانوں کے بدلتے لہجے اور بدلتے اطوار سے نبرد آزما تھا۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

یہاں 'دکھ' اور 'زمانے' کی ترکیب، نو آبادیاتی اور سرمایہ دارانہ جبر کے استعارے ہیں۔ وہ جبر و تسلط جس کے لیے سامراج کو کہیں باہر سے آ کر مسلط ہونے کی ضرورت نہیں تھی۔ آزادی کے بعد پاکستانی ریاست نے عوام کی توقعات کے برعکس استحصال، غربت اور قید و بند کی وہی روش جاری رکھی جو سامراجی عہد میں جاری تھی۔ یہ اس وجہ سے ہوا کہ برطانوی سامراج جاتے جاتے اپنا طریقہ کار، منظم انداز میں مقامی مقتدرہ کے دل و دماغ میں راسخ کر گیا تھا۔ یوں جسمانی آزادی کسی حد تک نصیب ہوئی لیکن ذہنی غلامی بدستور قائم دائم رہی جو غیروں کی تہذیب و معاشرت اور زبان کی صورت آج بھی موجود ہے۔ فیض اس 'آزادی' کو 'داغ داغ اجالا' کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

یہ داغ داغ اجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں

یہ نظم دراصل نئے نو آبادیاتی نظام کے تحت ہونے والے عوامی استحصال کا بیانیہ ہے، جس میں آزادی کے نام پر ملنے والی مایوسیوں اور محرومیوں کا گہرا شعور ملتا ہے۔ فوجی حکومتوں نے جب آزادی اظہار پر قدغنیں لگائیں، دانش وروں کو جیلوں میں ڈالا اور عوامی تحریکوں کو کچلا تو فیض احمد فیض نے نہ صرف اس رویے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی بلکہ خود قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔ ان کے اشعار میں قید خانے، زنجیر، سلاخیں اور ظلمت کی علامتیں جبر اور تشدد کی سیاست کی عکاسی کرتی ہیں۔ نظم "بول کہ لب آزاد ہیں تیرے" آمریت اور استبداد کے خلاف ایک جرات مندانہ اعلان جنگ ہے۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

یہ نظم آمریت کے خلاف نہ صرف فیض کی اپنی بغاوت ہے بلکہ اس پورے عہد کے مظلوم عوام کی ترجمانی بھی ہے جنھیں خاموش رہنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

فوجی آمریت کے خلاف فیض کی سب سے معروف نظم "ہم دیکھیں گے" ہے۔ اس میں فیض نے نہایت بلیغ انداز میں استحصالی نظام کے خاتمے اور عوامی انقلاب کی نوید سنائی ہے۔ اِس نظم میں 'ظلم و ستم کے کوہِ گراں' فوجی آمریت اور حکومتی جبر کی علامت ہیں۔ یہ نظم آمریت کے خلاف عوامی جدوجہد، عوامی بغاوت اور ایک روشن مستقبل کی امید کا استعارہ ہے۔ فیض کے ہاں عوامی مسائل، بھوک، غربت، استحصال، مہنگائی اور بے روزگاری جیسے مسائل بھی ایک مسلسل موضوع رہے ہیں۔ ان

کی شاعری میں 'اندھیرے'، 'ماتم'، 'لہو'، 'زنجیر' اور 'قید' جیسے استعارے محض لفظی سجاوٹ نہیں بلکہ سماجی حقیقتوں کی علامت ہیں۔

فیض احمد فیض کی پوری شاعری دراصل جبر، آمریت، سامراجی ورثے اور طبقاتی استحصال کے خلاف ایک مسلسل احتجاج ہے۔ وہ آزادی کے نام پر قائم ہونے والے اس نظام کے سب سے بڑے ناقد تھے، جس میں عوام کی آزادی، خوش حالی اور حقوق پسِ پشت ڈال کر ایک محدود طبقے کو اقتدار دے دیا گیا۔ فیض نے اس منافقانہ نظام کے خلاف قلم اٹھایا اور اپنی نظموں کو مزاحمت کا ہتھیار بنایا۔

ان کی شاعری میں عوام کے زخموں کی تصویر کشی بھی ہے اور ان زخموں پر مرہم رکھنے کی مسیحائی بھی۔ یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری آج بھی ظلم کے خلاف مزاحمت اور آزادی کی جدوجہد کرنے والوں کے لیے فکری رہنما کا درجہ رکھتی ہے۔ فیض کی شاعری رجائیت کی ایک گہری جھلک بھی پیش کرتی ہیں، جو مشکلات کے درمیان ایک نئی صبح کی امید جگاتی ہے۔ وہ جبر و تشدد میں شکست تسلیم نہیں کرتا، بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ آگے بڑھنے کا حوصلہ دیتا ہے:

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے

نو آبادیاتی نظام کا تسلسل کہیں رکتا نہیں؛ نو آبادیات اصل میں تسلط اور جبر ہے اور پس نو آبادیات اس کا خاتمہ اور بعد کا دور ہے۔ ہم اگر نو آبادیات اور تسلط کو دیکھیں تو یہ اب بھی جوں کا توں ہے۔ صبحِ آزادی کے بعد غلامی کا خاتمہ ہونا تھا جبکہ ایسا نہ ہو سکا۔ وڈیروں کا نظام نیچے سے محکوم لاتا ہے اور ان کی اولادیں بھی غلام ابن غلام بنتی چلی جاتی ہیں جہاں احتجاج کا دوسرا نام موت ہے۔ وہ نظام کی تبدیلی کا خواہاں ہے۔ وہ نظام نہیں جہاں عوام کو خوش حالی کا خواب دکھا کر غربت کے تاریک گڑھوں میں عمیق سے عمیق تر دھکیل دیا جائے بلکہ وہ اُس نظام کے داعی ہیں جو ہر ایک کو معاشی برابری اور خوشحالی کی ضمانت دے۔

فیض جب اپنے اردگرد نگاہ دوڑاتے ہیں تو وہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ہر طرف زبان بندی ہے، وہی قید و بند، زبانوں پر تالے ہیں۔ جب معاشرتی بدحالی کا یہ عالم ہو کہ قوم کو انٹرنیٹ کے تابع کر دیا گیا ہو اور ان کی سوچ اور فہم کو جدید نو آبادیاتی حربوں سے کچھ اِس طرح کنٹرول کیا جائے کہ اُن کی سوچیں حکمرانوں کی ہمنوا بن جائیں تو اِس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم پس نو آبادیاتی عہد میں ہوتے ہوئے ابھی ایک نئے نو آبادیاتی نظام میں جی رہے ہیَ۔ یعنی نو آبادیات کا نظام ویسے کا ویسا ہی ہے بلکہ

پہلے سے کہیں زیادہ منظم صورت میں جاری و ساری ہے ۔یعنی ہم آزاد نہیں ہوئے؛ ہمارے فقط آقا بدلے ہیں۔ فیض کی شاعری کو مجموعی طور پر دیکھا جائے تو ہر ہر قدم مزاحمت کی داستان اور ہر گام امید کا سورج روشن کرتی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں حبس کی فضا میں بھی ہوا ہے، جھونکوں کی امید ہے؛ زنداں میں بھی روزن کی تلاش ہے اور یہی امید آنے والے روشن کل کی دلیل ہے۔

فیض کسی ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک تحریک کا نام ہے۔ یہ وہ نام ہے جس نے مزدوروں، کسانوں اور معاشرے بے نواؤں سے پیار اور انسانیت کے احترام کا درس دیا ہے۔ وہ فرقوں سے بالاتر ہو کر انسانیت کی بات کرنے والے مرد مجاہد تھے۔ وہ کسی مزدور کو پسینے میں شرابور دیکھتے تو ان کی کیفیت اور ہو جاتی۔ جب تک آمریت کے خلاف، ظلم و جبر اور استحصال و استبداد کے خلاف ایک بھی آواز اٹھے تو سمجھ لیجئے کہ فیض زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔

حوالہ وحواشی

1. سبط حسن، "سخن در سخن"، (کراچی: حوری نورانی، 2016ء)، ص117
2. نسرین بیگم، ڈاکٹر، "فیض کی شاعری میں انقلاب کا تصور"، مشمولہ: "فیض شناسی کے جدید زاویے"، (لاہور: طیب شمشاد پرنٹرز، لاہور، 2015ء) ص156
3. نوشین توقیر، "فیض عشق وانقلاب کا شاعر"، مشمولہ: "شاعرِ خوش نوا"، فیض احمد فیض، "، (لاہور: طیب شمشاد پرنٹرز، لاہور، س۔ن)، ص388
4. جمیل جالبی، ڈاکٹر، "فیض ایک تقابلی مطالعہ"، (کراچی: افکار، 1972ء)، ص44
5. فیض احمد فیض، "نسخہ ہائے وفا"، (دہلی: ایجوکیشنل پبلیکیشنز، 1986ء)، ص338
6. فیض احمد فیض، نسخہ ہائے وفا، ایجوکیشنل پبلیکیشنز، دہلی، 1986ء، ص، 138
7. فیض احمد فیض، "نقش فریادی"، نظم: "یاس"، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1992ء)، ص39
8. ایضاً، نظم: "انتظار"،
9. ایضاً، نظم: "آج کی رات"، ص41
10. فیض احمد فیض، "دست صبا"، نظم: "دو عشق"، (دہلی: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، 1992ء)، ص47 – 10
11۔ فیض احمد فیض، "نقش فریادی"، نظم: "یاس"، ص636